

ڈاکٹر تقی عابدی کا گھر

ایک عظیم الشان مکان کا دروازہ کھلا۔ ڈاکٹر سید تقی عابدی مسکراتے باہر آئے۔

”آپ کا انتظار بہت دیر سے تھا۔“ وہ بولے۔

”ہم علامہ اقبال کے متقد ہیں۔ دیر سے آتے ہیں۔“

”ٹھیک کہا۔ اقبال دیر سے آتا ہے۔“

”آج کے اقبال کا دیر سے آنا، راستہ بھول جانا تھا۔“

”صبح کا بھولا صبح ہی گھر آ جائے تو اسے بھولا نہیں کہتے۔“ تقی عابدی نے کہا۔

بڑے دروازے سے اندر داخل ہوئے۔ دو میزھیوں کے بعد سنگ مرمر کا فرش، سامنے اوپر

جانا زینہ، سیدھے ہاتھ پر ڈرائنگ روم، بائیں طرف کوریڈور۔

ہم کشادہ ڈرائنگ روم میں آ بیٹھے۔ تقی عابدی کی بیگم نسبی آئیں یہ ایرانی ہیں۔ اردو سمجھتی اور

بولتی ہیں۔

انہوں نے فارسی میں کچھ کہا اور تقی عابدی بولے۔

”آئیے ناشتے پر گفتگو ہوگی۔“

”آپ نے ناشتہ نہیں کیا۔ اس وقت تو گیارہ بجے ہیں۔“

”آج چھٹی ہے۔ پھر آپ کا انتظار تھا۔“

بائیں طرف باورچی خانہ برابر ڈائننگ ٹیبل، ایک کرسی پر ہم اور دوسری پر تقی عابدی بیٹھ گئے۔ گیتی ایک ڈش لائیں، پلیٹیں، چمچے، بسم اللہ کیجئے۔“ وہ بولیں۔ ”ڈش کا ڈھکن اٹھایا۔“ آپ کے لیے نہاری ہے۔“

”ارے آپ کو کیسے معلوم ہوا ہم نہاری شوق سے کھاتے ہیں۔“

”انسان کراچی، لاہور میں رہے اور اس ڈش سے رغبت نہ ہو یہ ممکن نہیں۔“ تقی عابدی نے

کہا۔ پھر چمچے سے دو بوٹیاں پھر شوربا پلیٹ میں ڈالا۔ اس میں نہاری والی کوئی چیز نظر نہ آئی۔

”یہ بکرے کی زبانیں ہیں ایران کا خاص ڈش..... نیبو، ہر ادھنیہ، ہری مرچیں ڈال کر نوش

کریں۔“ تقی عابدی نے سلیقے سے سچی ایک ڈش سامنے کر دی۔

”زبانیں.....؟“ ہم نے حیرانی سے اپنی پلیٹ کو دیکھا۔

”یہ ہم پہلی بار کھائیں گے۔“

”اور مایوس نہیں ہوں گے۔“ تقی عابدی نے جملہ پورا کیا۔

گیتی ایک ڈش میں بیگل لے آئیں یہ گول روٹی کی طرح ہوتے ہیں۔

”ایرانی روٹی۔“ عابدی بولے۔

”ہم اسے امریکی سمجھتے تھے۔ کئی دن سے گھر سے نکلے ہوئے ہیں کیا خبر ایران پر امریکہ نے

دھاوا بول دیا ہو۔ اور اب ان کی روٹی بھی ایرانی ہوگئی ہو۔“

بیگل اور بکرے کی زبان دونوں کا اشتراک پہلی بار پیکھا۔ نیبو، ہر ادھنیہ اور مرچوں نے لطف

دیا۔ ”یہ لذیذ ہے۔ ہم ناشتے اور کھانے کے درمیان برنج سمجھ کر کھا رہے ہیں۔“

یہ سننا تھا کہ تقی عابدی نے چمچے سے دو زبانیں اور ہماری پلیٹ میں رکھ دیں۔

”اتنی زبان نہ کھلائیں۔ اب ایسا نہ ہو ذرا دیر بعد ہم منمنانے لگیں۔“
 کہتی یہ ڈش اکثر پکاتی ہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو ہم وہی زبان بول رہے ہوتے۔“ تقی عابدی ہنسنے لگے۔

”ہم نے سنا ہے۔ مفضل بادشاہ شہزادیوں کو بلبل کی زبان سمجھواتے تھے، ان کے لہجے میں شیرینی آجائے۔“ ہم نے کہا۔

”وہ بلبل اور شہزادیوں کا میل تھا۔ ہم ان میں سے کوئی بھی نہیں۔ اس لیے اطمینان سے کھائیں جو زبان بولتے آئے ہیں وہی بولتے جائیں گے۔“ تقی عابدی نے ڈھارس بندھائی۔
 زبان اچھی ہو تو پسند کی جاتی ہے۔ تقی عابدی نے اصرار کر کے اتنی کھلا دیں کہ ہماری زبان بند ہوئی۔ پیٹ بھر گیا لیکن کہتی کا تکلف نہ گیا۔

”اور کھائیں..... اور لیں..... یہ لیجئے۔“

عابدی نے فارسی میں شاید سمجھایا۔ اس لیے وہ چائے لینے چلی گئیں۔
 ہم عابدی کے ساتھ برابر کے ڈرائنگ روم میں آ بیٹھے۔ جہاں ٹیلی ویژن پر کوئی پروگرام دکھایا جا رہا تھا۔ عابدی نے بند کیا۔ اس وقت پلیٹوں میں آم آ گئے۔

”یہ آپ کے لیے پاکستان کا چونسنا۔“ وہ بولے۔

”پاکستان کا چونسنا..... یہاں..... کیسے.....؟“ ہم حیران تھے۔

”جناب ٹورانٹو میں باقاعدہ ہفتے میں دو بار آتا ہے۔“

ہم نے ایک قاش اٹھا کر، تکیسی چکھی، واقعی یہ چونسنا تھا۔

”آپ نے بڑا ظلم کیا۔ پہلے بتایا، پھر اس کے لیے بھی تنگہ رکھتے۔ نہاری سے پہلے آم

ہماری کمزوری ہے۔“

”اس میں ہم بھی شامل ہیں۔“ تقی بولے۔ ”شروع کیجئے۔ صحت مند انسان ہیں۔“

”آپ ڈاکٹر ہیں۔ ایک کانڈر لکھ دیں تاکہ بوقت ضرورت کام آسکے۔“

”آم کھانے سے انسان صحت مند رہتا ہے غالب کی مثال سامنے ہے۔ رہنے اچھا طبی کے

باوجود 73 سال زندہ رہے۔ آم کھانے کی وجہ سے۔“ تقی نے کہا۔

”اتنی عمر کافی ہے۔“ ہم نے آم کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

آم کی قاشیں کھلانے کے لیے تقی عابدی کو اصرار نہیں کرنا پڑا۔ جب تک چائے آئی پلیٹیں

خالی ہو گئیں۔

”اور.....“ وہ بولے۔

”بانڈھ دیں..... ساتھ لے جائیں گے۔“ ہم نے کہا۔

”انہوں نے آواز دے کر کیتی سے فارسی میں کچھ کہا۔

ہم منع کرتے رہے لیکن وہ آم کی دو پلیٹیں لے آئیں۔ چائے کی مہک اچھی، اور ذائقہ پسندیدہ

تھا۔ یہ نہاری اور آم پر بگھاڑ تھی۔

ہم تقی عابدی کی لائبریری دیکھنے کے مشتاق تھے۔ جس کی ایک عالم میں دھوم ہے۔ اس لئے

جلدی چائے ختم کی۔ ایک طرف سفید سبزھی گھومتی نیچے جا رہی تھی۔ اس سے گھومتے آخری سرے

پر قدم رکھا تو ایک ہال دکھائی دیا۔ سوڈیز سوا فراد کی محفل آسانی سے ہو سکتی تھی۔

دائیں طرف راستہ تھا۔ دونوں سمت، چار بیڈروم جو ضرورت کی ہر چیز سے آراستہ تھے۔

مہمان خانہ ہے۔ اہم اور ممتاز دانشور یہاں ٹھہرتے ہیں۔ آخری کمرہ تقی عابدی کے استعمال میں

ہے یہاں انٹرنیٹ، فیکس، ٹیلی فون، ٹیلی وژن سب ہی کچھ ہے۔ دنیا سے منسلک رہتے ہیں۔ تقی

عابدی کا زیادہ وقت یہاں صرف ہوتا ہے۔ مسودے کی جانچ، کتابوں کا مطالعہ اور تنقیدی مضامین

کا لکھنا اس کمرے میں ہوتا ہے۔

اس کے بعد وہ بڑا کمرہ جو اردو ادب کا بیش قیمت خزانہ ہے یہاں صدیاں سانس رو کے

کھڑی ہیں۔ وقت تھم گیا ہے۔ ہاتھ سے لکھے ہوئے یعنی مخطوط رکھے ہیں۔ یہ انمول ہیں، انہیں

حاصل کرنے کے لیے تقی عابدی نے وقت کا سرمایہ اور اچھے ان گنت دن لگائے ہیں۔ اس

لائبریری میں 1440 مخطوط ہیں جس میں زیادہ تعداد مرثیوں کی ہے۔ جس میں فارسی اردو دونوں

شامل ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق ان کا تعداد کی تعداد 8 سے 9 لاکھ ہے۔

کنیڈا انتظار میں ہے

ہم ذرا دیر میں ماضی میں اترنے لگے۔ یہ لکھنؤ ہے۔ میراٹس کا زمانہ ہے، سید لی بے میر کا دور ہے، یہ لہ آباد ہے، اکبر آبادی کا شہر ہے۔

تقی عابدی محبت سے نادر پرانی تحریریں دکھا رہے تھے۔ کانڈا کارنگ اڑ گیا ہے۔ کہیں کتابت دھندلی پڑ گئی ہے۔ تاریخ پڑھی نہیں جاتی۔ نام مٹا ہوا ہے۔ لیکن مرثیے کے بند، غزل کے شعر موجود ہیں۔

یہ محفوظات صاف شفاف پائسلک کی تھیلیوں میں محفوظ ہیں ان پر تاریخ اور وقت لکھا ہے۔ اگر زمانے میں یہ رسم تھی جس سے آج ناکندہ ہوا۔ دور کا اندازہ ہوتا ہے۔

کتاب سے محبت کرنے والے بہت ہیں لیکن اس حد تک دیوانہ کم ہوں گے۔ یہ تحریریں تقی عابدی کے دل کے ٹکڑے، جگر کے گوشے ہیں۔ جن لوگوں نے یہ مرثیے لکھے، غزلیں تحریریں کیس شاید وہ بھی اتنی چاہت نہ کر سکے ہوں۔ وہ کب واقف تھے کہ برسوں بعد ایک شخص بہستی بہستی، پر بت پر بت ان تحریروں کو تلاش کرے گا۔ شاید یہ رضا الہی ہے کہ اس کے پیاروں کے لیے لکھے، اذیت محفوظ رہیں اور تقی عابدی الہیری میں جمع ہو جائیں۔ دنیا میں کسی شخص کی ذاتی الہیری میں اتنی تعداد میں محفوظات نہ ہوں گے۔ گینتربک آف ورلڈ ریکارڈ والوں کو ان کا نام ایک ریکارڈ کی صورت میں محفوظ کرنا چاہیے۔

ہمارے سامنے 1200ھ 226 سال پرانا مرثیہ تھا۔ یہ ایسے لوگوں کا ملک، جان کی ملکیت ہے۔ شاعر نے مرثیہ لکھا اور ملکہ کے نام کر دیا۔ ملکہ کو زمین کی چار ماہی لکھن مرثیے پر لکھا نام صاحبان مرثیے کے طفیل زندہ رہ گیا۔ 225 سال پرانا مرثیہ مرثیہ خلیفہ کا تقریر کردہ ہے جب کہ زینب نے سنا صح لڑائی ہوگی۔ میراٹس کے والد محترم تھے۔ اللہ نے ان کے ہاتھ ان کے مرثیے لکھنے کا فن عطا کیا تھا۔

نول کشور نے لکھنؤ سے 1880 میں میر تقی میر کا دیوان راج لکھا۔ اس نے ایک نیا دیوان پرونیس آغا حیدر حسن کے پاس تھی۔ وہ مطالعہ کرتے پسندیدہ اشعار پر سرفرازان لکھتے۔ وہ ہمارے سامنے تھا۔ اور موموں نے اس پر کوئی اثر نہیں ڈالا تھا۔

مرزا انیس کے بھائی اس کے شاگرد فضل رسول فضل تھے۔ ان کے مرثیے دیکھے۔
 بنگلہ کی شاعرہ روپ کماری مسلمان ہو گئی۔ اس نے جو مرثیے لکھے وہ ہمارے سامنے تھے۔
 وقت نے اسے بھی لافانی کر دیا۔ تقی عابدی کے لائبریری میں آرام سے ہے۔ یہ اس کا دیوان
 شاع کر رہے ہیں۔ اس کا منتساب سید محمد حمید رضوی کے نام کیا ہے۔ یہ بھی ایک عجیب واقعہ ہے۔
 2004ء میں خالق دنیا ہال کراچی پاکستان میں مرثیہ پر گفتگو کی ایک محفل تھی۔ ڈاکٹر فرمان فتح
 پوری صدارت کر رہے تھے۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے تقریر کی۔ تقریب کے اختتام پر ایک صاحب ان
 کے پاس آئے۔

”میں آپ کو کچھ دینا چاہتا ہوں۔ کہاں ٹھہرے ہیں؟“
 تقی عابدی نے ہوٹل کا نام بتا دیا۔ وہ صاحب چلے گئے۔
 شام کو عابدی کو واپس آنا تھا۔ یہ تیار ہو کر نیچے اترے تو وہ صاحب ہاتھ میں بستے لیے کھڑے
 تھے۔ ”یہ آپ کے لیے۔“ وہ بولے۔

انہوں نے کھول کر دیکھا۔ اس میں 38 نادر مرثیوں کے مخطوط تھے۔ تقی عابدی کو خزانہ مل گیا۔
 خوشی سے دل دھڑکنے لگا۔ ان صاحب کو النگ لے جا کر پوچھا۔
 ”کیا نذرانہ پیش کروں؟“

”یہ میری طرف سے تحفہ ہے۔ آپ سے بہتر کون اس کا حق دار ہوگا۔“ یہ سید محمد حمید رضوی
 تھے۔ ڈاکٹر تقی عابدی کیا کرتے..... بس آنکھوں میں شکرانے کے سمندر لے آئے۔ کتابوں کی
 الماریوں کے درمیان شاعر، ادیب، نقاد اطمینان سے آرام کر رہے تھے۔

”ان کاغذات کو موسموں کے احتساب اور وقت کی دیمک سے کیسے محفوظ کریں گے؟“ ہم
 نے پوچھا۔

”کوڈک کینی ایک مشین ایجاد کر رہی ہے۔ جس کے محلول میں کاغذ ڈبو یا جائے تو اس پر
 مخصوص پلاسٹک کی تہہ چڑھ جائے گی یوں سمجھیں پلاسٹک کو تنگ ہوگی۔ پھر وقت اس پر اثر انداز
 نہیں ہوگا۔“

”یہ کب تک آجائے گی؟“

”دو سال میں۔ میں نے آرڈر دے دیا ہے۔ اس کی قیمت 5 ہزار ڈالر ہوگی۔“

تقی عابدی دنیا کے ممتاز پیتھالوجسٹ میں شمار ہوتے ہیں۔ انسانوں کے ساتھ کاغذوں کی حفاظت بھی جانتے ہیں۔

دیوار پر علامہ اقبال کی ایک قلمی تصویر لگی تھی ایک واقعہ اس کا بھی ہے۔ اسے قیوم حیدر آبادی نے 1941ء میں بنایا تھا اقبال اکیڈمی حیدرآباد دکن نے اس کی نمائش کی تھی۔ اس کا ڈکڑا کٹر صفحہ قادری کی کتاب میں ہے۔ جو حیدرآباد دکن سے شائع ہوئی۔ دوسری کتابوں میں بھی اس کی تفصیل ہے۔ تصویر کی عمر 64 سال ہوگی۔ ہم نے دیدار کیا۔

اردو کی پہلی صاحب دیوان خاتون شاعرہ ماہ لقا چندا یوی ہیں۔ یہ غالب سے چند سال پہلے شاعری کرتی تھیں۔ حیدرآباد کی نامی گرامی طوائف تھیں۔ ان کی قبر حیدرآباد دکن کے مولامن ٹاؤن میں موجود ہے۔ وہ کہتی ہیں۔

تم منہ لگا کے غیروں کو مفرور مت کرو،

لگ چلنا ایسے ویسے سے دستور مت کرو،

چند ا یوی کا دیوان دو سال پہلے شائع ہوا۔ اس کی ایک کاپی آئی ماہی ماہی کے پاس، کیکر حیرت ہوئی۔

اس شاعرہ نے اپنے نام ماہ لقا اور چندا بانی دونوں سے فائدہ اٹھایا۔ اشعار میں اس کا استعمال کر کے مصرعوں کا حسن بڑھایا۔ اس لائبریری کے مخطوطات دیکھنا بڑے اعزاز کی بات ہے۔

تقی عابدی علامہ اقبال کے مدح ہیں۔ ان دونوں شکوہ جواب شکوہ کی اشاعت کی تیاری میں مصروف نہیں۔ ہمیں کتابت کا نمونہ دکھایا۔ لاہور کے ایک نامی گرامی کاتب نے اسے لکھا ہے۔ ہر صفحے پر ایک بند، انہوں نے نہیں بتایا لیکن ہمیں معلوم ہوا۔ کاتب نے سب کے ایک ہزار روپے لیے۔ یہ کل 65 بند ہیں۔ اتنی رقم علامہ اقبال کو مل جاتی تو وہ کم از کم شکوہ نہیں لکھتے۔

مخطوطات جمع کرنے میں کبھی انہیں سخت کٹھن منزلوں سے گزرنا پڑا۔ تقی عابدی کو خبر ملی لکھنؤ کے علاقے فیض آباد کے ایک گاؤں میں ایک صاحب کے پاس نادر مخطوط ہیں۔

یہ بغیر دیر کے اس سمت روانہ ہو گئے۔ فصل کٹ چکی تھی۔ گرمی کا موسم تھا۔ کھیتوں سے کچی پگڈنڈی سے گزرتے بے حال ہو گئے۔ پیاس اور گرمی کی شدت کا اندازہ اس دن ہوا۔

گاؤں آ گیا..... ایک شکت گلی میں پہنچے۔ اس کے کونے پر ایک پرانا مکان تھا۔ وقت اس پر سے بڑی بے دردی سے گزرا تھا۔ یہی منزل مراد تھی۔ مکان کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ ایک بزرگ نے باہر جھانکا پھر دروازہ بند کر لیا۔

تقی عابدی مکان کے برابر پتھر پر بیٹھ کر سانس درست کرنے لگے۔ منزل پر پہنچ کر ناکام نہیں ہونا چاہتے تھے۔ ذرا دیر بعد دوبارہ دروازے پر دستک دی۔ اس بار نہ صرف دروازہ کھلا بلکہ آواز آئی ”اندر تشریف لائیے۔“

یہ کامیابی کی آواز تھی۔ تقی عابدی تیزی سے اندر پہنچے ہلکا اندھیرا اور ٹھنڈک کا احساس، سامنے ایک بزرگ کھڑے تھے۔ انہوں نے تخت کی طرف اشارہ کیا۔

”تشریف رکھیے۔“ یہ بیٹھ گئے۔

”فرمائیے؟“

”سنا ہے آپ کے پاس کچھ مرثیوں کے مخطوط ہیں۔“ تقی عابدی نے کہا۔

”جی..... فرمائیے..... پھر.....؟“ بزرگ نے پوچھا۔

”میں انہیں دیکھنا چاہتا ہوں، بہت دور سے آیا ہوں۔“ عابدی بولے۔

سنجیدہ بالوں والے بزرگ نے ایک لمحے کو سوچا پھر اٹھ کر چلے گئے۔ کچھ دیر بعد واپس آئے ایک میلے کچیلے کپڑے کا بستہ لائے۔ سامان بیٹھ کر احتیاط سے کھولا۔ تقی عابدی نے دیکھا۔ گدڑی میں لعل۔ ہمت کر کے کہا۔

”میں ایک لائبریری بنا رہا ہوں۔ میرے پاس سینکڑوں مخطوط ہیں۔ کیا آپ مجھے یہ دے

سکتے ہیں؟“

بزرگ نے فوراً بستہ بند کر لیا۔

”میرے پاس یہ زیادہ محفوظ رہیں گے۔ آپ جو کہیں ۱۰۰ نذرانہ پیش کروں؟“ تقی عابدی نے ہمت نہیں ہاری۔

بزرگ خاموش رہے۔

”میں ان کاغذات کی حفاظت کا بہت اچھا انتظام کیا۔ یہ نذرانہ کون لے گا؟“

”کیا پیش کریں گے؟“ بزرگ بولے۔

”جو آپ فرمائیں۔“ تقی عابدی کو کامیابی نظر آنے لگی۔

”بزرگ سوچتے رہے پھر بولے۔“ تیرہ ہزار روپے۔“

تقی عابدی کے لیے یہ قیمتی ہیرے کوڑیوں کے مول تھے۔

”جی..... میں پیش کرتا ہوں۔“ جیب سے روپے نکال کر بزرگ کو دیئے۔ انہوں نے پیلے

کیڑے کا بستہ تقی عابدی کے حوالے کیا۔

چہرے سے لگتا تھا اپنے جگر کا گوشہ حوالے کر رہے ہیں۔

”یقین کریں اس کی بہت دیکھ بھال کروں گا۔“

بزرگ آزرہ تھے۔

”ایک گلاس پانی مل جائے گا۔“ عابدی بولے۔

بزرگ مردہ قدموں سے اٹھ کر گئے۔ مٹی کے کوزے میں پانی لے آئے اور روپے لوٹاتے

ہوئے کہا۔

”میں نے تیرہ ہزار مانگے تھے۔ آپ نے غلطی سے 26 ہزار دے دیئے یہ زائد رقم! ایس

ہے۔“

”قبلہ میں نے 26 ہزار ہی دیئے ہیں۔ کاش میں 26 ارب دے سکتا۔ آپ نے انمول

خزانہ دیا ہے۔ اس کا کوئی مول نہیں۔ براہ کرم حقیر نذرانہ قبول کر لیجئے۔“ تقی عابدی نے نرم لہجے

میں کہا۔

سفید بالوں والے بزرگ سامنے کھڑے تھے اور تقی عابدی نے دیکھا ان کی آنکھوں سے گزنگا
 جنٹائیں کناروں سے چھلکا چاہتے تھے۔ پھر وہ منہ پھیر کر اندر چلے گئے۔
 تقی عابدی گاؤں سے واپس آ رہے تھے تو گرمی تھی نہ پیاس نہ تھکن۔ موسم جانے کب
 خوشگوار ہو گیا تھا۔ کھیتوں میں فصلیں لہلہا رہی تھیں۔ پات ہرے تھے۔ پھول کھلے تھے۔ رم جھم
 باد باراں تھی۔ اور تقی عابدی تیز تیز قدموں سے فیض آباد کی طرف آ رہے تھے۔ جیسے اودھ فتح
 کر کے آ رہے ہوں۔

☆.....☆.....☆